مذاکرہ

پاکستان کی خارجہ پالیسی

پاک امریکہ تعلقات، نیوکلیر صلاحیت، کشمیر

خارجہ پالیسی کے مسائل پاکستان کے لیے زندگی اور موت کے مسائل ہیں۔ ان مسائل پر صحیح پالیسیاں اور تدابیر اختیار کی جائیں، اس سے ہر دردمند پاکستانی کو گہری دلچسپی ہے۔ سکڑتی ہوئی دنیا میں پاکستان جیسے چھوٹے ملک کو ویسے بھی امریکہ، روس اور بھارت جیسی بڑی طاقتوں کے دباؤ اور دست برد سے اپنی سلامتی اور مفادات کو محفوظ رکھنا بہت مشکل تھا، واحد سپرپاور کی دنیا نے یہ اور مشکل کر دیا ہے، اور اس کا اندرونی سیاسی عدم استحکام اور انتشار اور معاشی بدحالی اس راہ میں سنگ گراں بن گئی ہیں۔ اس پر مستزاد نااہل اور قومی مفادات سے غافل قیادت۔ آزادی کے وقت سے ہی پاک امریکہ تعلقات ہماری خارجہ پالیسی کا محور رہے ہیں، اور اب ربع صدی سے یہ تعلقات نیوکلیر صلاحیت کے محور پر بگڑتے جا رہے ہیں۔ موجودہ حکومت ان تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے ہر معاملے پر امریکہ کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کے لیے اور بساط عالم پر اس کا مہرہ بننے کے لیے آمادہ نظر آتی ہے۔ ان حالات میں ہر دردمند پاکستانی تشویش کا شکار ہے۔

ان مسائل پر ہم ملک کی ایسی چار شخصیتوں کے خیالات پر مشتمل ایک مذاکرہ پیش کر رہے ہیں جو صرف دانش ور اور ماہر ہی نہیں ہیں، بلکہ جن میں سے بعض کے ہاتھوں میں خارجہ پالیسی کی باگیں بھی رہی ہیں، اور وہ اس کی نزاکتوں اور خطرات سے خوب واقف ہیں۔ جناب آغا شاہی امور خارجہ کے سکریٹری (۱۹۷۳ تا ۱۹۸۰) اور وزیر (۱۹۸۰ تا ۱۹۸۲) رہے۔ جناب عبدالستار کیریر ڈپلومیٹ ہیں اور وہ بھی خارجہ سکریٹری اور وزیر (۱۹۹۳) رہے ہیں۔ جنرل (ر) خالد محمود عارف، جنرل ضیاء الحق کے ساتھ ڈپٹی چیف آف آرمی اسٹاف تھے، اور جناب فرحت اللہ بابر موجودہ حکومت میں سینیر عہدیدار ہیں۔

جناب فرحت اللہ بابر کے خیالات آئی پی ایس کی کتاب - Foreign Policy Debate The years ahead. سے ماخوذ ہیں' جبکہ باقی تین حضرات نے اپنے ان خیالات کا اظہار سینیٹ کی فارن ریلیشنز کمیٹی کے سامنے کیا۔ (مدیر)

۱۔ آغا شاہی

سابق وزیر خارجہ پاکستان

پاک امریکہ تعلق میں مد و جزر

پاک امریکہ تعلقات میں نئے رجحانات کا آغاز ۱۹۹۰ میں اس وقت ہوا جب صدر بش نے پاکستان کے پاس ایٹم بم نہ ہونے کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۸۲ سے ملنے والی ۶۰۰ ملین ڈالر کی سالانہ فوجی اور اقتصادی امداد بند ہوگئی۔ تعلقات کشیدہ اس لیے ہوگئے ہیں کہ پاکستان نے اس بات سے انکار کر دیا ہے کہ وہ عدم پھیلاؤ معاہدہ (NPT) پر یک طرفہ دستخط کر دے' اور 'بھارت کرے یا نہ کرے' اپنی ایٹمی صلاحیت منجمد کر دے بلکہ ختم ہی کر دے۔ یورینیم افزودگی کے پروگرام کو ۱۹۸۹ میں معطل کر دیا گیا' لیکن اس سے امریکہ کی تشفی نہ ہوئی۔ وہ اس کا خاتمہ چاہتا ہے۔ اب پریسلر ترمیم لاگو ہے اور ہم ان ایف ۱۶ طیاروں سے محروم ہیں جن کی قیمت ہم ادا کر چکے ہیں۔ وزیراعظم کے دورے سے کچھ بہتری کی امید ہوئی ہے لیکن طیاروں کی فراہمی یا مکمل رقم کی واپسی کا امکان کم ہی ہے۔

امریکہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے کہ پاکستان کا نیوکلیر پروگرام بھارت سے تین جنگوں کے پس منظر میں ہماری سلامتی کے لیے ناگزیر ہے۔ بھارت کی فوجی برتری ہماری سلامتی کے لیے خطرہ ہے۔ پریسلر ترمیم نے ہمارے روایتی دفاع کی صلاحیت کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس لیے ہمارے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ آخری چارہ کار کے طور پر ایٹمی صلاحیت کو ترقی دیں۔ ہمارے لیے اس کا جواز بھارت یا اسرائیل سے کہیں زیادہ ہے جو اپنے پڑوسیوں پر فوجی برتری رکھتے ہیں۔

پاکستان کو اب یہ توقع نہیں کرنا چاہیے کہ ماضی کی سرد جنگ کے دوران یا ۸۰ کے عشرے میں افغانستان کے حوالے سے پائے جانے والے تعلقات دوبارہ قائم ہوں گے۔ روسی سلطنت کے زوال کے بعد جنوبی ایشیا کی صورت حال میں جو تبدیلی آگئی ہے' اس کے بعد اس کا کوئی امکان نہیں' خصوصاً اس لیے کہ صدر کلنٹن "بھارت سے بہتر' مضبوط تر اور وسیع ترین تعلقات" کا عزم کیے ہوئے ہیں۔ امریکہ سلامتی کونسل میں بھارت کی مستقل نشست کی کوشش کی حمایت کر رہا ہے اور اس کے ساتھ اسٹریٹیجک شراکت قائم کرنے کی فکر میں ہے۔ ہمیں امریکہ سے' اس کی اسرائیل اور ایران

پالیسیوں کے پیش نظر، کم تر سطح کے تعلقات پر راضی ہونا ہو گا۔ ماضی میں جب ہمارے امریکہ سے خصوصی تعلقات تھے ' امریکی پالیسیوں کی وجہ سے ان تعلقات میں اتار چڑھاؤ کے دور آتے رہے ہیں اور پاکستان ان کا عادی ہو گیا ہے۔ ہندستان کو بھاری اقتصادی امداد اور چین کے ساتھ جنگ کے دوران زبردست فوجی سازوسامان کی فراہمی ' ۱۹۶۵ کی جنگ میں پاکستان کی امداد پر بندش ' ۷۱ کی جنگ میں پاکستان کی امداد سے دست کشی ' ۱۹۷۸ میں فرانس پر دباؤ ڈال کر ایٹمی پلانٹ کی منسوخی ' ۱۹۷۹ میں تمام امداد کا انقطاع ' افغانستان کی جنگ ختم ہوتے ہی پریسلر ترمیم کا اطلاق --- امریکہ کی بدلتی ہوئی روش کے چند مظاہر ہیں۔ اس لیے اس کا حالیہ مخالفانہ انداز ہمارے لیے تعجب کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔ اگرچہ اب وہ جو سزا دے رہا ہے وہ ماضی کی نوازشات کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔

پاکستان کو ایک خطرناک صورت حال کا سامنا ہے۔ ایک طرف اگر وہ واحد سپر طاقت سے قریبی تعلقات قائم کرنا چاہے تو اسے اپنی سلامتی کو قربان کرنا ہو گا ' اور ایٹمی صلاحیت کو لپیٹ کر رکھ دینا ہو گا۔ دوسری طرف اسے سپرپاور کی طرف سے شدید اقدامات کا خطرہ ہے۔ میرے خیال میں اسے اپنی سلامتی کو اور علاقائی تعلقات کو ترجیح دینا چاہیے۔ نئے بین الاقوامی نظام میں اجتماعی سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں ہے ' اور اگر بھارت ایٹمی حملہ کرے تو کسی ایٹمی طاقت سے مدد کی قابل اعتماد ضمانت بھی نہیں ہے ' اس لیے پاکستان کو اپنی سلامتی کے لیے خود اپنے اوپر ہی انحصار کرنا ہے۔ یہی ہمارے ایٹمی پروگرام کی حقیقی اہمیت ہے۔ اس لیے اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہم نے ایٹمی متبادل کو یک طرفہ ترک کر دیا ' یا یک طرفہ منجمد کر کے اسے مجروح کر لیا تو پاکستان کی سلامتی سخت خطرے میں پڑ جائے گی۔

یورینیم کی پیداوار کا انجماد

جنیوا میں تخفیف اسلحہ کانفرنس میں ایٹمی دھماکے کی صلاحیت رکھنے والے افزودہ یورینیم اور پلوٹینم کی پیداوار کے مکمل انقطاع پر مذاکرات جاری ہیں۔ ۲ ' ۳ سال بعد جب معاہدہ نافذ ہو گا تو اس وقت جو قابل انفجار مواد موجود ہوں گے ' وہ اس کی زد میں نہیں آئیں گے۔ بھارت ' اسرائیل اور پاکستان جنھوں نے این پی ٹی پر دستخط نہیں کیے ہیں ' اس وقت اپنے پاس موجود مواد سے بم بنانے کے لیے آزاد ہوں گے۔ اگر ہماری افزودگی کی صلاحیت ۱۹۸۹ کی سطح پر منجمد رہی ' جو ہم کر چکے ہیں تو اس وقت بھارت کا ذخیرہ ہم سے ۲۰ گنا یا اس سے بھی زائد ہو گا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ کنونشن سے امریکہ کا اصل مقصد بڑی طاقتوں کے اسلحے کی روک تھام نہیں ' بلکہ اسرائیل ' بھارت اور پاکستان پر قدغن لگانا ہے۔ امریکہ کو اسرائیل سے تو کچھ کہنا نہیں ہے ' اس لیے بھارت اور پاکستان رہ جاتے ہیں۔ امریکہ دونوں

ملکوں سے اس سلسلے میں یک طرفہ اقدامات کا تقاضا کرتا رہا ہے۔ ہم ۱۹۸۹ میں 'پابندی کی تاریخ سے کئی برس پہلے ہی 'امریکہ کے دباؤ میں آکر اپنا پروگرام منجمد کر چکے ہیں۔ جب کہ بھارت نے امریکی دباؤ کا مقابلہ کیا ہے' اور وہ ہر سال ۲۵ بموں کی صلاحیت پیدا کر رہا ہے۔ ۱۹۸۹ میں ہمارے پاس ایک بم کی صلاحیت تھی تو اس کے پاس چھ کی تھی۔ ۹۷-۱۹۹۶ میں اس کے پاس ۲۰۰ بموں کی صلاحیت ہوگی' جبکہ ہمارے پاس وہی ۱ کی رہے گی' کیونکہ پاکستان اپنی پیداوار منجمد کر چکا ہے۔

یہ صورت حال بھارت کے پرتھوی میزائل کے مقابلے میں پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کی استعداد بلکہ بقا تک کو مشکوک بنا دے گی۔ بھارت نے پاکستان کی تمام اہم دفاعی' صنعتی اور ترقیاتی تنصیبات کو نشانہ بنانے کے لیے کم سے کم ۱۰۰ ایسے میزائل تیار کرنے کا ہدف پہلے ہی طے کر لیا ہو گا۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ پاکستان یورینیم افزودگی کے پروگرام پر عمل کا دوبارہ آغاز کر دے تاکہ عالمی پابندی سے پہلے پہلے ہم بھارت کے مقابلے میں اپنا فرق کم سے کم کر سکیں۔ امریکہ ہماری توانائی کے شعبے میں یا دوسرے منصوبوں میں کتنا ہی سرمایہ لگائے' ہمیں کچھ روایتی اسلحہ فروخت کرنے پر آمادہ ہو جائے' کوئی بات بھی ایٹمی پروگرام کو منجمد رکھنے کی' کجا اس کو پیچھے لے جانے یا ختم کرنے کی قیمت نہیں ہو سکتی۔

پاکستان کے لیے لازم ہے کہ وہ ایٹمی مواد کی پیداوار کے انقطاع کے معاہدے کی اصل شکل واضح ہونے تک دستخط کرنے کا پہلے سے ہرگز وعدہ نہ کرے۔ بھارت اور پاکستان دونوں ہی اصولی طور پر انقطاع کے پابند ہیں' لیکن اصل کھیل تفصیلات میں ہے۔ بھارت کسی وقت بھی اپنے ایٹمی پلانٹ (۵ ریسرچ ری ایکٹر' ۳ پلوٹونیم پلانٹ' ۱ نیوکلیر پاور پلانٹ) بین الاقوامی نگرانی میں نہ دینے کی پالیسی طے کر سکتا ہے۔ ہم نے اس سے پہلے یک طرفہ وعدہ کر کے اپنے ہاتھ باندھ لیے' تو ہمارا واحد کہوٹہ پلانٹ اس نگرانی کا شکار ہو جائے گا۔

پاکستان کو اپنی ایٹمی پالیسی بھارت کی ایٹمی پالیسی کی مناسبت سے مرتب کرنا چاہیے۔ جنوبی ایشیا کے حوالے سے deterance کی اہمیت ہے۔ اس کا مشاہدہ گذشتہ ۴۰ سال میں مشرق اور مغرب کے تعلقات میں ہو چکا ہے۔ جنوبی ایشیا میں اس کا کردار لڑائی لڑنے کا نہیں' بلکہ اس سے بچانے کا ہے۔ پہلے نقطہ نظر سے ایٹمی اسلحے کے انبار لگانا ہوں گے جب کہ دوسرے کے مطابق' کم سے کم سطح پر برابری کی صلاحیت کا حصول جنگ سے محترز رکھے گا اور روایتی اسلحے کی تخفیف اور سیاسی تعلقات کی بحالی میں بھی کردار ادا کرے گا۔

میزائلوں نے حملے کا پہلے سے انتباہ کا دورانیہ چند منٹ کا کر دیا ہے۔ بھارت اور پاکستان کو اپنے اسلحے کو ایٹمی بنانے اور میزائل نصب کرنے کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے غور و فکر کرنا چاہیے۔

یہاں بھی کلید بھارت کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ایسی کوئی علامت نہیں جس سے اس کی جانب سے مثبت ردعمل کی توقع ہو۔

ایٹمی اسلحے میں برابری کے مسائل کے ساتھ ساتھ حکم دینے، رابطہ کرنے اور کنٹرول سی۔ ۳ کے مسائل بھی کسی تاخیر کے بغیر غور و فکر کے مستحق ہیں تاکہ دونوں فریق کسی غلطی یا حادثے کی وجہ سے جنگ میں نہ الجھ جائیں۔ اسی طرح بہت سے دوسرے مسائل ہیں جنھیں اب نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ جتنی جلدی دونوں حکومتیں ان کو طے کر لیں، اتنا ہی ان کے عوام کے لیے اور جنوبی ایشیا کے دوسرے ممالک کے عوام کے لیے بہتر ہو گا۔

۲۔ جنرل (ر) خالد محمود عارف

سابق ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف

تمہید

بنیادی بات یہ ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کو پاکستانی عوام کی امنگوں اور ان کی ethos کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔

ظاہر ہے کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی ان ملکوں کے دباؤ سے آزاد نہیں ہو سکتی جو اس کے ذریعے اپنے مفادات کا حصول چاہتے ہیں۔ لیکن داخلی طور پر متحد اور معاشی طور پر خوشحال ممالک اس قسم کے دباؤ کا مقابلہ کامیابی سے کر سکتے ہیں، جبکہ ترقی پذیر ممالک مزاحمت کی زیادہ طاقت نہیں رکھتے، خصوصاً پاکستان کی سیاسی محاذ آرائی اور داخلی صورت حال اسے زیادہ ہی کمزور کر رہی ہے۔ جتنا ملک کمزور ہو گا بیرونی دباؤ کا اتنا ہی آسانی سے شکار ہو گا۔ خوشنما اعلانات سے سیاست میں کام چل سکتا ہے، لیکن دفاعی صلاحیت کے بارے میں اس طرح کے اعلانات کے پس پشت متناسب قوت موجود نہ ہو تو اس سے عوام میں سلامتی کا جھوٹا احساس پیدا ہوتا ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ملک کی سلامتی، مسئلہ کشمیر، نیوکلیر مسئلے اور معاشی ترقی جیسے نازک اور اہم مسائل پر قومی اتفاق رائے موجود ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم اس اتفاق سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنے اپنے فوری مفادات کی خاطر افتراق کا شکار ہیں۔ اسی حکومت اور حزب اختلاف کی محاذ آرائی کی وجہ سے ان اہم قومی امور پر معروف جمہوری طریقے کے مطابق کمیٹیوں کے ذریعے مناسب حکمت عملی کا تعین اور اس پر اشتراک عمل تک مفقود ہے۔

مسئلہ کشمیر

مجھے نہیں معلوم کہ ہماری کوئی طویل المیعاد کشمیر پالیسی ہے یا نہیں ' اور اگر ہے تو اس کو حسب حالات تشکیل دیتے رہنے کا کیا انتظام ہے۔ کشمیر کے مسئلہ کی اہمیت متقاضی ہے کہ اس مقصد کے لیے وزیراعظم کی صدارت میں ایک خصوصی کشمیر کمیٹی قائم کی جائے 'جس میں قائد حزب اختلاف کے نامزد کردہ ایک ایک ایم این اے اور سینیٹر شامل ہوں۔ یہ کمیٹی کشمیر پر قومی پالیسی بنائے 'اس کے لیے حکمت عملی طے کرے اور اس کی تنفیذ کی نگرانی کرے۔ اور ان کی تجاویز کی روشنی میں جامع کشمیر پلان مرتب کر کے اس پر عمل کیا جائے۔

کشمیر کے حوالے سے چند امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ کشمیر کے سب حریت پسند بھارت کے مخالف ہو سکتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ سب پاکستان کے حامی ہوں۔ لبریشن فرنٹ کے نعرہ آزادی میں کشش ہے اور اس کے اثرات آزاد کشمیر میں بھی ہو سکتے ہیں۔

۲۔ آزاد کشمیر میں جمہوری عمل اعلیٰ درجے کا اور بالکل شفاف ہونا چاہیے تاکہ بھارتی کشمیر کے عوام کو اس میں کشش محسوس ہو۔ آزاد کشمیر حکومت کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش بھارت کے مقاصد پورا کرے گی اور مقبوضہ کشمیر کے عوام کو پاکستان سے دور کر دے گی۔

۳۔ طاقت 'شہرت اور دولت کا اپنا نشہ ہوتا ہے۔ جہاد کے اختتام پر حریت پسند اپنا اختیار چھوڑنا پسند نہیں کریں گے 'جیسا کہ افغانستان میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں اس بارے میں ابھی سے فکر کرنا چاہیے۔

۴۔ اخلاقی اقدار اور عملی سیاست کاری کے تقاضے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے ' اگر مظلومین مسلمان ہوں تو مغرب انسانی حقوق کے بارے میں بے حس ہوتا ہے۔ چنانچہ کشمیر پر دنیا کی توجہ اور ہمدردی مرکوز رکھنے کے لیے ہمیں انسانی حقوق کے علاوہ دوسرے زاویے بھی تلاش کرنا چاہییں۔

۵۔ جدوجہد آزادی کا مسلسل پیشہ ورانہ جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ کشمیری مجاہدین اسے کتنی مدت تک اور کس قیمت پر برقرار رکھ سکتے ہیں؟ اس کی رفتار کو دوستانہ عناصر کے تعاون سے برقرار رکھنا بے حد ضروری ہے۔ بھارت کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ عنقریب صورت حال کو پلٹ دے گا۔

۶۔ بھارت کو کشمیر میں لڑائی میں مشغول رکھنا 'کوئی بڑی جنگ انگیخت کیے بغیر 'ممکن بنانا چاہیے۔

۷۔ یہ امر تشویش ناک ہے کہ عراقی حدود میں ترکی کے اور افغانستان پر روس کے حالیہ ہوائی حملے ایک سنگین کارروائی تھے لیکن دنیا نے ان کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ دنیا کی یہ بے حسی بھارت کی

حوصلہ افزائی کر سکتی ہے کہ وہ لائن آف کنٹرول پار کر کے حملے کرے۔ اس صورت حال کے مضمرات کا جائزہ لے کر' ابھی سے متعلقہ حلقوں کو آگاہ کرنا چاہیے۔

۸۔ بھارت پاکستان بالواسطہ تجارت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میں بعض بڑے سیاسی نام بھی لیے جاتے ہیں۔ غیر سرکاری اعداد و شمار کی بنیاد پر بھارت کے دانش ور تجارتی پابندیاں ختم کرنے کی آواز بھی اٹھا رہے ہیں۔ ان تجارتی بے قاعدگیوں کی تفتیش ہونا چاہیے۔

پاک امریکہ تعلقات

۱۔ اگر امریکہ کے اپنے قومی مفادات معرض خطر میں آجائیں تو وہ ٹھوس اقدامات کرتا ہے۔ عدم پھیلاؤ معاہدے میں توسیع' کویت' ہیٹی اور ایران اس کی چند مثالیں ہیں۔ اس کے برعکس بوسنیا' صومالیہ' روانڈا اور کشمیر پر وہ صرف زبانی جمع خرچ کرتا ہے۔ اس کا یہ رویہ اسے ایک ناقابل اعتماد غیر یقینی عالمی طاقت بناتا ہے۔

۲۔ امریکہ سے تعلقات کے بارے میں ہمیں امریکی خیرسگالی کے حصول اور قومی مفادات کے تحفظ کے درمیان نہایت احتیاط سے توازن رکھنا چاہیے۔ چند سال قبل یورینیم افزودگی کے منصوبے سے دستبرداری کی پالیسی نے امریکہ کو پاکستان پر دباؤ ڈالنے اور سزا دینے کی کارروائی پر شیر کر دیا ہے۔ اگر ہم انصاف کے اصولوں پر منطقی انداز میں اپنا کیس اچھے انداز سے پیش کریں تو شاید امریکی اسے بہتر سمجھ سکیں گے۔ وہ ہماری کمزوری کو لازماً ہمارے خلاف استعمال کریں گے۔

۳۔ ہمیں امریکہ سے اپنے تعلقات معمول پر ضرور لانا چاہییں مگر اپنے اصولوں پر سمجھوتہ کیے بغیر۔ وزیراعظم کے دورہ امریکہ سے قبل کے ان کے فیصلوں کی صدر کلنٹن نے جس گرم جوشی سے تعریف کی اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہ فیصلے واشنگٹن کی خاطر کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے دورہ کے بعد کی صورت حال یہ ہے کہ پریسلر ترمیم قائم ہے' اور مجوزہ تبدیلیاں نمائشی ہیں۔ ایف-۱۶ طیاروں کے بارے میں ہم خواہ مخواہ ہی خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے حالانکہ ہمیں اپنی رقم کے ساتھ سود اور ہرجانہ بھی طلب کرنا چاہیے۔ ہمارے اسلحے کی مرمت پر زیادہ رقم طلب کی جا رہی ہے۔ جہاں تک ہمارے فوجی افسران کو تربیت کی سہولت کا تعلق ہے' تو یہ دراصل امریکہ کے اپنے طویل المیعاد مفادات کا حصہ ہے۔

۴۔ ہم سے اندرونی معاملات میں حماقتیں سرزد ہوئی ہیں لیکن خارجہ پالیسی کے باب میں ہمارے بڑے بڑے فیصلے بالعموم درست ثابت ہوئے ہیں۔ چین سے ہمارے تعلقات' ماضی میں امریکہ سے تعلقات' جہاد افغانستان کی حمایت' اور نیوکلیر پالیسی' اس کی کچھ مثالیں ہیں۔ اب لگتا ہے کہ

خارجہ امور پر ہماری گرفت ڈھیلی ہو رہی ہے۔ آئی ایم ایف کے نگران اسلام آباد میں مستقل قیام کر کے ہمارے بجٹ اور مالی پالیسیوں کو طے کرتے ہیں۔

۵۔ کیا ہمیں اسلام کی تعبیر کے لیے کسی ویٹیکن کی مدد کی ضرورت ہے؟ امریکہ اور اس کے اتحادی ہمیں مذہبی انتہا پسندی کے خلاف وعظ کہنے کا حق نہیں رکھتے۔ وہ خود یورپ ' امریکہ ' اسرائیل اور آسٹریلیا میں نسلی صفائی کے مرتکب ہیں۔ جو ہم پر اسلامی بنیاد پرستی کا الزام لگاتے ہیں ' ہمیں ان مسلمانوں کے نام بتائیں جنھوں نے نسلی امتیاز کی پالیسی اختیار کی ہو یا ریڈ انڈین اور قدیم باشندوں کا خاتمہ کیا ہو۔

۶۔ اقوام متحدہ کے امن دستوں میں پاکستان کی شمولیت پر امریکہ خوش ہوتا ہے لیکن جو ملک دستے فراہم کر رہے ہیں ان کو اقوام متحدہ کے فیصلوں کی تنفیذ کے بارے میں پالیسی فیصلے کرنے کا اختیار ملنا چاہیے۔ بوسنیا میں اختیار اور فیصلے کا پورا نظام برطانوی اور فرانسیسی افسران کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نو استعماریت ہے۔

۷۔ عراق جنگ کے بعد خلیجی ممالک سے ہمارے تعلقات سرد مہری کا شکار ہیں۔ آخر ان ممالک میں منشیات کی تجارت کے الزام میں کتنے پاکستانیوں کے سر قلم ہونے کے بعد ہم اپنے ملک کے بڑے منشیات فروشوں پر ہاتھ ڈالیں گے؟ امریکہ نے ہمارے کئی معروف بڑوں پر کھلے عام الزام لگایا ہے۔

۸۔ باہمی صحت مند تعلقات ' امریکہ اور پاکستان دونوں کے مفاد میں ہیں۔ دونوں ممالک سفارتی تعلقات کو درست کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں دوسرے متبادل بھی تلاش کرنا چاہییں اور خارجہ پالیسی کو کثیر الجہت بنانا چاہیے۔ پاکستان اور روس کے تعلقات کی سطح کا مستقل نیچے رہنا ہماری سیاست کاری کے لیے کوئی قابل تعریف بات نہیں۔ یہ بات کہ ہماری وزیراعظم اب تک اس کا دورہ نہیں کر سکی ہیں ' اس امر کا غماز ہے کہ ہم روس کو صحیح مقام نہیں دے رہے۔ چین ' سعودی عرب اور مصر کے ساتھ ہمارے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں۔

۹۔ وسط ایشیائی ممالک کے ساتھ بھارتی سرمایہ کاروں نے تجارتی تعلقات وسیع کر لیے ہیں جب کہ ہماری کارگزاری لفاظی تک ہے۔ ایکو (ECO) افغانستان میں امن کے قیام تک موثر نہیں ہو سکتی۔ ہم اس ہمسائے کے معاملے میں بے صبری کا مظاہرہ کر رہے ہیں ' اور تجارت کی آمدورفت ' سمگلنگ اور راہ داری کی سہولت کے مسئلوں پر اسے تنگ کر رہے ہیں۔ ان امور کی ایک طویل تاریخ ہے۔ یہ امور جلدی میں طے نہیں ہو سکتے۔ افغانستان ہمارا قریبی اور اہم پڑوسی ہے اور اس میں امن اور استحکام ہماری ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے ساتھ ہمارے تعلقات کی سطح کا گراف نیچے جا

رہا ہے۔ اب ہمیں وہاں امن کے پیامبر کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جاتا۔ ہمیں اس پر تشویش ہونی چاہیے۔

۳۔ عبدالستار

سابق وزیر خارجہ پاکستان

خارجہ پالیسی کے سلسلے میں کئی ممالک کے ساتھ تعلقات پر بحث ضروری ہے' خصوصاً چین' جاپان' یورپ' جرمنی' روس اور خلیجی ممالک کے ساتھ۔ اور بھارت تو ہے ہی ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ۔ لیکن فی الحال میرا موضوع صرف پاک امریکہ تعلقات ہیں۔

پاکستان پر امریکہ کو نظرانداز کرنے کا الزام تو کسی طرح نہیں لگایا جاسکتا: ہمارے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا تب بھی ہم نے امریکہ کو خوش کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اسلحے کی فروخت اور اقتصادی امداد کی بندش کو بھی ہم نے خوشی خوشی برداشت کیا۔ ہمارے جیسے غریب ملک کے ایک ارب ۔۴ کروڑ ڈالر کی پیشگی ادائیگی کے باوجود ایف ۱۶ طیاروں کو روکے رکھنے سے بھی ہمارے جوش و جذبہ میں کمی نہ آئی۔

نسبتاً زیادہ باوقار پالیسی اختیار کرنے کی تجویز کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم دوسری انتہا کی طرف چلے جائیں۔ ہماری حکومتوں نے مقابلے پر آکر ٹکر لینے سے احتراز کیا ہے' اور ٹھیک ہی کیا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کا احساس ہے کہ امریکہ نے جتنا نقصان ہمیں پہنچایا ہے' اس سے زیادہ پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود' ہماری حکومتیں امریکہ کو جتنی اہمیت دیتی ہیں اس پر تعجب ہوتا ہے۔ امریکہ ہمیں کوئی امداد نہیں دیتا' ہم سے غیرمنصفانہ سلوک کرتا ہے' لیکن ہمارے سیاسی راہ نماؤں پر خوب اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ غالباً وہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ ہی ملک میں ان کی حکومت قائم رکھ سکتا ہے' یا اسے گرا سکتا ہے۔

ہم اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ امریکہ کی بدلتی پالیسی اس کی سلامتی اور معیشت کے بدلتے مفادات کی آئینہ دار ہے۔ ۷۰ کے عشرے کے وسط سے پاکستان کو ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے سے روکنا اس کا مرکزی نکتہ رہا ہے۔ افغانستان پر روسی حملے کی مزاحمت کے صلے میں ہمیں کچھ انعام دیا گیا' لیکن اس کے بعد سے ایٹمی پروگرام ہی کی وجہ سے ہم مسلسل بدترین دباؤ کا شکار ہیں۔ اس میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ واشنگٹن یا اسلام آباد میں کون حکومت کر رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اگر ہم اس کی صحیح وجہ تلاش کر سکیں تو ہم خطرات سے بچاؤ اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے مناسب تدابیر اختیار کر سکتے ہیں تاکہ مستقبل میں ناکامیوں سے بچ سکیں۔

امریکی پالیسی میں تبدیلی

یکم فروری ۱۹۹۵ کو امریکہ کے وزیر دفاع ولیم پیری نے نیویارک میں تقریر کرتے ہوئے پریسلر ترمیم کو ایک کند ہتھیار قرار دیا' جو نہ صرف غیر موثر ہے بلکہ الٹے نتائج دے رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کلنٹن انتظامیہ نے اس ترمیم کے خلاف رائے بنانا شروع کر دی۔ وزیر توانائی ہیزل اولیری اور وزارت دفاع اور وزارت خارجہ کے اعلیٰ افسران' جوزف نائی اور رابن رافیل نے کانگریس کے سامنے یہ تسلیم کیا کہ یہ ترمیم صرف پاکستان کو نشانہ بناتی ہے اور امتیازی ہے۔ ولیم پیری نے یہ بھی کہا کہ پاکستان اس علاقے میں امن کے لیے کلید ہے' کہ پریسلر ترمیم سے صرف پاکستان ہی کو نقصان پہنچا ہے' بلکہ علاقے میں امریکہ کے تجارتی اور اسٹرے ٹیجک مفادات کے لیے بھی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔

درحقیقت ہماری وزیراعظم کے امریکہ پہنچنے سے مہینوں پہلے اس ترمیم پر نظرثانی کے عمل کا آغاز ہو چکا تھا' یہ کہنے کا مطلب وزیراعظم کے دورہ کی اہمیت کو کم کرنا نہیں۔ انھوں نے نہایت لیاقت سے پاکستان کا کیس پیش کیا اور حمایت حاصل کی۔ لیکن اہل پاکستان کے لیے ابھی صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ ہم صرف یہ امید اور خواہش کر سکتے ہیں کہ صدر کلنٹن اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں اور ہم کو اپنی خریدی ہوئی چیزیں مل جائیں' یا قیمت واپس مل جائے۔ لیکن ہمیں یہ ضرور غور کرنا چاہیے کہ امریکہ میں پریسلر ترمیم پر نظرثانی کی ضرورت کا احساس کیوں پیدا ہوا؟ شاید ہم امریکی ذہن کو مکمل طور پر نہ پڑھ سکیں' لیکن ہم یہ ضرور دیکھ سکتے ہیں کہ پاکستان نے بھی رعایتیں دی ہیں اور ان کی کیا قیمت ادا کی ہے۔

نیوکلیر مسئلے پر پسپائی کی قیمت

ایک جواب تو ولیم پیری کی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ پاکستان اپنا نیوکلیر پروگرام ترک کرنے پر راضی نہیں کیا جا سکا ہے۔ یعنی امریکی پالیسی میں تبدیلی انصاف اور قانون کی بنیاد پر نہیں' اس ترمیم کی ناکامی کی وجہ سے ہے۔ اس کا کریڈٹ ہمیں اپنے عوام کو دینا چاہیے جو ملک کی سلامتی کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہیں' اور خود امریکی تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان کے عوام نیوکلیر ترقی کو ملک کی سلامتی کے لیے فیصلہ کن سمجھتے ہیں۔ لیکن پاکستان نے ۱۹۸۹ میں افزودہ یورینیم کی پیداوار بند کر کے جو رعایت دی ہے' ہمیں اس کی سنگینی کو نظرانداز نہ کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم نے یک طرفہ اقدامات کی مخالفت کے اپنے دیرینہ اصول کو ترک کر دیا۔ گذشتہ ۶ سال سے یہ تعطل برقرار ہے حالانکہ اس سے پاکستان کی طویل المیعاد سلامتی کو خطرہ لاحق ہے۔ شاید واشنگٹن کیپ کرنے کے فیصلے پر عوامی ردعمل سے آگاہ

ہے۔ اس لیے اس نے تعریفی الفاظ اور ظاہری طور پر نرم موقف اختیار کر کے اسلام آباد کو نوازنا ضروری سمجھا۔

امریکہ کو مداخلت کی اجازت

حکومت نے امریکی پولیس کو پاکستان کی حدود میں کام کرنے کی اجازت دے کر' اور ملکی قوانین کو بالائے طاق رکھ کر امریکہ کو مطلوب افراد اس کے حوالے کر کے واشنگٹن کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ اپنے قوانین کو نظرانداز کر کے اور ریاست کی خود مختاری پر سمجھوتہ کر کے ہم نے کیا کھو دیا ہے۔ ہماری حکومت نے جو کچھ کیا ہے اس سے خلافت عثمانیہ کے زوال کے دور میں یورپی طاقتوں کے آگے اس کی سپراندازی کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔

اسلامی بنیاد پرستی کے خلاف فرنٹ لائن

بے نظیر کلنٹن مشترکہ اعلامیے میں پاکستان کو اسلامی دنیا میں معتدل رویے کو آگے بڑھانے میں کلیدی کردار تفویض کیا جانا بھی کم تعجب خیز نہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ معتدل رویے کا لفظ انتہا پسندی کے برخلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ امریکہ نے کمیونزم کی جگہ ایک نیا خطرہ اسلامی بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کا ایجاد کر لیا ہے۔ یہ بالکل نظرانداز کر دیا کہ امریکہ میں بھی انتہا پسند ہیں (مثال: اوکلاہوما)' یہودیت' عیسائیت اور ہندومت میں بھی بنیاد پرستی کی تحریکیں ہیں۔ پھر آخر پاکستان صرف اسلامی دنیا میں اعتدال کی ضرورت کے حق میں بیان پر کیوں راضی ہوا؟

یہ خوب ستم ظریفی ہے کہ ہماری اسلامی جمہوریہ کی حکومت جو دستوراً پابند ہے کہ "مسلم ممالک میں اسلامی اتحاد کی خاطر باہمی تعلقات کو قائم اور مضبوط کرے" وہ نام نہاد اعتدال پسندی کے لیے فرنٹ لائن بننے کے لیے اتنی زیادہ بے چین ہے۔ صرف مسلم دنیا کے خلاف یہ مہم چلانے والوں کے ساتھ شامل ہو کر پاکستان اسلام دشمن طاقتوں کے ہاتھ میں کھیلے گا۔ ان اسلام دشمن طاقتوں کے ہدف پر ایران' لبنان کی حزب اللہ' فلسطین کی حماس اور مصر کی اخوان المسلمین اور الجزائر کا اسلامک فرنٹ ہیں۔ اگر ہم مسلم عوام کی امنگوں اور آرزوؤں سے بے نیاز ہو جائیں تو پاکستان کی روح کو چین نہیں آئے گا۔ یہ کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی کو بھی نقصان پہنچانے کا باعث ہوگا جسے بھارتی اور بعض غیر ملکی میڈیا مسلم انتہاپسندی کا نام دیتے ہیں۔

ایران دشمنی میں ہم نوائی سے اجتناب

پاکستان کو اپنا دامن اس سے بالکل پاک رکھنا چاہیے کہ وہ امریکہ کی ایران دشمن مہم میں کسی

طرح بھی ملوث ہو' یا ملوث ہونے کا تاثر پیدا ہونے دے۔ امریکی سینیٹ کی ایک کمیٹی میں پاکستان اور ایران کے غیر صحت مند روابط کی حوصلہ شکنی کی ضرورت کا اظہار کیا گیا لیکن ہمیں اپنے مفادات کا خود شعور ہونا چاہیے۔ پاکستان ایران سے اپنے دوستانہ تعلقات پر کسی سمجھوتہ یا اس برادر پڑوسی کو تنہا کرنے کی کسی حکمت عملی میں شرکت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یقیناً پاکستان امریکی پالیسیوں پر اثرانداز ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہے' اور نہ وہ ان کی مذمت کرنے کی قیمت ادا کر سکتا ہے' لیکن ایران کے ساتھ اقتصادی تعاون بڑھا کر اس کے ساتھ اپنی یک جہتی کا اظہار کر سکتے ہیں اور ہمیں یہ ضرور کرنا چاہیے۔

وزیر اعظم کا دورہ امریکہ

ہماری وزیراعظم کے دورہ امریکہ میں ہمارے ملک کی تاریخ میں پاکستان کے کسی سربراہ کے دورہ سے بھی زیادہ پیسہ بہایا گیا ہے۔ ۷۰ کے عشرے سے بڑے بڑے قافلے ساتھ جانے کی روایت پڑی ہے لیکن اس سے قبل کبھی بھی حکومت پاکستان اور پبلک سیکٹر کارپوریشنز نے واشنگٹن پوسٹ میں ۲۲ صفحات' اور اسی طرح نیویارک ٹائمز میں کروڑوں روپے صرف کر کے اشتہارات نہیں دیے۔

تصادم اور سپر اندازی کے درمیان توازن

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات پر غیر یقینی کے سائے ہیں۔ ہمارے ایف-۱۶ جہازوں کے لیے پریسلر ترمیم پر نظرثانی کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ اگر یہ ہوجائے تو تعلقات کے ایک تکلیف دہ باب کا اختتام ہوگا۔ لیکن جب تک پریسلر ترمیم بطور قانون موجود ہے' تعلقات معمول پر نہیں آسکتے۔

پریسلر ترمیم رہے یا نہ رہے' پاکستان کو ایسی پالیسی اختیار کرنا چاہیے جو تصادم اور سپراندازی دونوں سے بچ کر رہے۔ ہم امریکی امداد کے بدلے میں اپنی ایٹمی صلاحیت کا سودا نہیں چکا سکتے' کماحقہ صلاحیت کے حصول کے لیے یورینیم افزودگی کی مطلوبہ سطح حاصل کرنے کے لیے ہماری حکومت کو امریکہ کی ناراضی کے ڈر سے ہچکچانا نہیں چاہیے' ایران کے ساتھ یک جہتی کے اظہار کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنا چاہیے۔ پاکستان کو عالمی سطح پر اعتدال پسندی کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے' لیکن بحیثیت اسلامی جمہوریہ اس کا یہ فریضہ ہے کہ وہ یہودیوں کے پھیلائے ہوئے اس مغربی پروپیگنڈے کی مخالفت کرے جو نام نہاد اسلامی بنیاد پرستی کو نئے دشمن کے طور پر پیش کر رہا ہے۔

۴۔ فرحت اللہ بابر

نیوکلیر پروگرام اور توانائی

ہماری خارجہ پالیسی کی تشکیل میں ہمارے نیوکلیر پروگرام کا کردار مرکزی حیثیت اختیار کر چکا

ہے۔ دوسری طرف ہمارے نیوکلیر پروگرام کے گہرے اثرات ہماری توانائی کی صورت حال پر پڑ رہے ہیں، جس کے ساتھ سلامتی، استحکام اور خارجہ پالیسی کا راست تعلق ہے۔ اس لیے نیوکلیر پروگرام کے مسئلے پر توانائی کے پہلو سے غور کرنا ضروری ہے۔

توانائی کے لحاظ سے پاکستان دنیا کے غریب ترین ممالک میں سے ہے: ہمارے ہاں اس کا استعمال دنیا کی اوسط کا ۱/۱۷، ترقی یافتہ ممالک کا ۱/۲۰ اور امریکہ کا ۱/۳۰ ہے۔ نیوکلیر توانائی کے مسئلے کا مطالعہ اس پس منظر میں کرنا چاہیے۔ ہماری توانائی کی حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ پٹرول پر دباؤ کم کر کے اسے صرف ٹرانسپورٹ تک محدود کر دیں، اور بجلی پیدا کرنے کے لیے گیس کا استعمال کم سے کم کریں۔ کیونکہ پانی کے ذریعے بھی ہماری بجلی کی ضروریات پوری نہیں ہو سکیں، اس لیے ہمیں تقریباً ۱۰ ہزار میگاواٹ کی کمی پوری کرنے کے لیے نیوکلیر توانائی پر انحصار کرنا ہو گا۔ لیکن یہ اتنا سادہ معاملہ نہیں۔ اس کا حصول بھارت اور پاکستان دونوں کے نیوکلیر پروگرام اور خارجہ پالیسی کے لیے مضمرات سے متعلق ہے۔

۱۹۷۴ میں بھارت کے ایٹمی دھماکے کے بعد پاکستان نے ری پروسسنگ اور یورینیم افزودگی کی حساس ٹیکنالوجی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان اقدامات کا براہ راست تعلق توانائی سے نہ تھا، لیکن اس سے پاکستان کے نیوکلیر پروگرام کے بارے میں شبہات پیدا ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی، فرانس اور کینیڈا سے کئی معاہدات منسوخ کیے گئے، یا ان پر عمل نہ کیا گیا۔ حد یہ ہے کہ کینیڈا نے کراچی کے نیوکلیر پاور پلانٹ (KANUPP) کے لیے فاضل پرزے، ایندھن اور دیگر ضروریات کی فراہمی پر پابندی لگا دی۔ اس طرح امریکہ نے ۱۹۷۶ میں سمنگٹن (Symington) لا کے ذریعے ہماری امداد کا سلسلہ بند کروا دیا۔ اس صورت حال نے پاکستان کے توانائی کے منصوبوں کے لیے بڑی مشکلات پیدا کیں۔

عدم پھیلاؤ کے بارے میں ہمارا موقف

پاکستان کا موقف ہے کہ وہ عدم پھیلاؤ پر یقین رکھتا ہے۔ این پی ٹی (NPT) پر ہمارے اعتراضات اخلاقی نہیں ہیں اور اگر بھارت دستخط کر دے تو ہم بھی دستخط کرنے کے لیے تیار ہیں۔ دوسری طرف بھارت کا موقف ہے کہ عدم پھیلاؤ معاہدہ ترقی پذیر ممالک کی سلامتی کے مسئلے کو نظرانداز کرتا ہے، اور اس کی بنیاد اس پر ہے کہ گورے نیوکلیر ٹیکنالوجی زیادہ ذمہ داری سے استعمال کریں گے۔ اس معاہدہ کے پردہ میں، ترقی یافتہ ممالک اپنے مستقل سیاسی اور معاشی غلبے کا راستہ ہموار کر رہے ہیں، اس لیے بھارت اس معاہدے پر دستخط نہیں کرے گا۔

اگر ہم ایٹم بم بنانے کی پالیسی اختیار کریں تو ہماری خارجہ پالیسی پر کیا دباؤ ہوں گے:

۱۔ ۱۹۹۰ کے بعد سے امریکہ کی ہر طرح کی فوجی اور اقتصادی امداد بند ہے۔

۲۔ چین' جنوبی افریقہ اور فرانس کی جانب سے معاہدے پر دستخط کی رضامندی نے ہمارے اوپر دباؤ بہت بڑھایا ہے۔

۳۔ امریکہ' روس اور مغربی یورپ کے ممالک تخفیف اسلحے کے مختلف معاہدات کے تحت ایٹمی اسلحے کے ذخائر کم کر رہے ہیں۔ اس سے دستخط نہ کرنے والوں کا ایک بڑا اعتراض ختم ہو گیا ہے۔

اس پس منظر میں امریکہ نے بھارت اور پاکستان پر اپنا دباؤ بہت بڑھا دیا ہے۔ ۱۹۹۲ میں امریکہ کی وزارت دفاع نے ایک ۴۶ صفحے کی دستاویز ایک اخبار کو افشا کی جس میں روس کے زوال کے بعد کی پالیسی بیان کی گئی تھی۔ اس دستاویز میں کہا گیا تھا کہ:

''امریکہ کو اس مسئلے سے سابقہ پیش آسکتا ہے کہ آیا وہ بڑے پیمانے پر تباہی کے اسلحہ جات کی تیاری اور استعمال روکنے کے لیے فوجی اقدامات کرے یا نہیں''۔ وسط ایشیا کی ریاستوں: قازقستان' یوکرائن اور بیلورشیا نے ایٹمی اسلحے روس کے حوالے کر دیے ہیں' مشرقی یورپ کے ممالک پر بھی نظر رکھی گئی ہے۔ اگر امریکہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوتا تو دنیا میں ایٹمی طاقتیں دگنی ہو جاتیں اور کئی دوسرے ممالک بھی تیاری کر رہے ہوتے۔

ہماری خارجہ پالیسی کے لیے ایٹمی اسلحے کی تیاری کے کیا مضمرات ہیں؟ ایک مختصر جائزہ:

۱۔ ایٹمی اسلحے کا حصول پڑوسی ممالک کو متوحش کر دے گا اور اسے بے اثر بنانے کے لیے ابتدائی سطح پر' یا کسی بحران کے موقع پر روایتی یا ایٹمی حملہ کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ اس کے اثرات معکوس ہو سکتے ہیں۔ روایتی دفاع کی صلاحیت اس لیے متاثر ہوگی کہ وسائل فراہم نہ ہوں گے اور باہر سے فوجی اسلحہ نہیں ملے گا۔ اس کی ایک واضح مثال ایف ۔۱۶ طیاروں کی فراہمی میں طویل تعطل ہے۔ اگر پابندی نہ لگائی جاتی (جو ایٹمی پروگرام کی وجہ سے لگائی گئی ہے) تو ۱۹۹۲ تک پاکستان کو ۱۰۰ ایف ۔۱۶ طیارے مل چکے ہوتے۔

۳۔ جب تک ہم خود انحصاری کی منزل حاصل نہ کر لیں' روایتی دفاعی صلاحیت برقرار رکھنے کے لیے امریکہ پر ہمارا انحصار فیصلہ کن ہے۔ حب وطن کے جوش میں ہمیں اس کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔

۴۔ ہمارے نہایت ضروری ترقیاتی پروگراموں کے لیے اقتصادی امداد خطرے میں پڑ جائے گی۔ امریکہ خواہ خود زیادہ امداد نہ دے' لیکن معطی ایجنسیز اور یورپی اور دیگر ممالک میں اپنا اثر و رسوخ

استعمال کر سکتا ہے۔

۵۔ اگر ہم ایٹم بم بنائیں گے ' تو یقیناً بھارت بھی بنائے گا۔ اس سے عدم استحکام پیدا ہو گا بلکہ ہماری سلامتی مزید کمزور ہو گی۔ اس لیے کہ بھارت کو دیگر کئی لحاظ سے پاکستان پر برتری حاصل ہے۔ یقیناً بھارت کے پاس زیادہ ایٹمی امکانات ہوں گے۔ اس لیے ہم اپنی ایٹمی صلاحیت سے دشمن کو باز رکھنے کی صلاحیت کے بارے میں ہمیشہ شک و شبہ میں مبتلا رہیں گے۔ ہم خود کار زینہ پر قدم رکھ دیں گے۔ کیا ہم اس کی اقتصادی قیمت ادا کر سکیں گے ' اقتصادی بدحالی سیاسی بے چینی کو جنم دیتی ہے۔ روس اس کی مثال ہے کہ قوت و سلامتی کی بے جا فکر نے اس کی معیشت کو برباد کیا اور ملک ٹوٹ پھوٹ گیا۔

بم بنانا ایک علیحدہ قدم نہیں ہے۔ یہ ایک آغاز ہے۔ جس میں آگے ہی آگے بڑھنا ہو گا۔ اگر دوسرا فریق بم گرانے کی تکنیک میں چند سیکنڈ کی برتری حاصل کر لیتا ہے تو ہماری باز رکھنے کی ساری حکمت عملی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ ہم سلامتی کی تلاش میں ' دہشت کا شکار ہو کر رہ جائیں گے۔

جب ہم اقتصادی قیمت کی بات کرتے ہیں تو صرف بم بنانے ' اسے گرانے اور اسے برابر بہتر بنا لینے سے مطلب نہیں ہوتا۔ ذرا یہ بھی سوچیں کہ ہم ترقی کے لیے کس کس ٹیکنالوجی سے ' توانائی کی ضروریات کے لیے کتنے پاور پلانٹس سے محروم رہیں گے اور سفارتی تنہائی اور (جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ۱۹۷۷ میں عدم استحکام) کی صورت میں کیا کیا قیمت ادا کریں گے۔ گذشتہ ۲۰ برس سے ہم اپنی قومی گرہ میں ایٹمی اسلحے کے پروگرام کی وجہ سے جس نے ہمیں سفارتی تنہائی کا شکار کر رکھا ہے ' ایٹمی توانائی کا ایک میگاواٹ بھی اضافہ نہیں کر سکے ہیں۔

ایٹم بم بنانے کی پالیسی سے ہمارے تعلقات صرف امریکہ اور روس سے ہی نہیں ' بلکہ جاپان اور یورپ کے ترقی یافتہ ممالک سے بھی خراب ہو جائیں گے۔ اس طرح کے منفی نتائج کے پیش نظر جرمنی ' جاپان ' کوریا ' تائیوان ' ترکی ' سویڈن اور اب مصر اور سعودی عرب جیسے ممالک نے جو اسلحے بنانے کے وسائل رکھتے تھے ' اسے ترک کر کے NPT پر دستخط کر دیے ہیں۔ سویڈن اور سوئٹزرلینڈ میں ۵۰ اور ۶۰ کے عشرے میں ایٹمی اسلحے کی حمایت اور مخالفت میں بڑی بحث ہوئی۔ یہ جنوبی کوریا میں بھی ہوئی۔ مختلف سیاسی اور اسٹرے ٹیجک صورت حال کے باوجود سب نے ایک ہی فیصلہ کیا۔ سویڈن نے تو بم بنانا شروع کر دیا تھا لیکن پھر مزید غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ اس کی سلامتی کے مفادات بم کے بغیر بہتر طور پر پورے ہوں گے۔ (اخذ و ترجمہ: مسلم سجاد)